اسد عباس عابد
اسکالر پی ایچ۔ ڈی اردو، اردو اور مشرقی زبانیں، یونیورسٹی آف سرگودھا

نیّر مسعود کے افسانوں میں لکھنؤ کا معاشرتی و ثقافتی پس منظر

Asad Abbas Abid
Research Scholar Ph.D, Department of Urdu and Oriental Languages, university of Sargodha.

The cultural and social background of Lucknow in the Stories of Naiyer Masud

Literature of any kind and genre can never avoid the essence of life. Literature represents numerous aspects and dimensions of life. Literature, culture and society are interlinked. Collectiveness is the soul of Society. This culture and it's colours reflect in the writings of the writers. Naiyer Masud is renowned short story writer having immense inclination towards culture and it's different shades. He had great inclination towards the culture of lucknow. Lucknow was the central city of state of Owaad. This article is an effort to bring forth the cultural and social background of Lucknow in the short of Naiyer Masud.

Keywords: *Life criticism, dimensions, culture, collectiveness, expressions, Travelogues, cultural existence, social life.*

ادب جس نوعیت کا بھی تخلیق کیا جارہا ہو وہ نقدِ حیات کے پہلوؤں سے فرار حاصل نہیں کر سکتا۔ ادب اپنی تہہ میں زندگی کی بہت سی جہات کی نمائندگی کرتا ہے تو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ زندگی کی تنقید بھی کر رہا ہوتا ہے۔ ادب، ثقافت اور معاشرہ کا آپس میں تعلق سامنے کا تعلق نہیں ہے، مگر اپنی تہہ میں بہت لازم اور گہرا تعلق ہے۔ انسان کسی نہ کسی سطح پر اپنے معاشرتی وجود کے لیے اجتماعیت کا ضرورت مند ہے اور یہ اجتماعیت ہی معاشرہ کے وجود کا سبب ہے۔ اسی معاشرے میں ادب انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کے اظہار کا معتبر اور درخشاں پہلو ہے۔

معاشرہ اپنے مسلسل اعمال کی بنا پر ایک روایت تشکیل دیتا ہے جس میں دو افراد کے اعمال سے لے کر زیادہ سے زیادہ افراد کے اجتماعی اعمال کی کہانی پنہاں ہے۔ ثقافت کی ترتیب میں معاشرے کے جملہ افراد حصہ لیتے ہیں اور اُن جملہ افراد کی مشترک تہذیبی میراث ہی ثقافت کہلاتی ہے، معاشرہ ثقافت کے وجود کے لیے ضروری ہے اور ثقافت معاشرہ کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی۔ معاشرہ اور ثقافت کے اظہار کا بہترین اور موثر ذریعہ ادب ہے۔

اودھ کا معاشرہ جس کی بنیاد نواب محمد امین سعادت نے رکھی۔ سلطنتِ اودھ کا آخری بادشاہ واجد علی شاہ تھا اور یہ سلطنت ۱۸۵۶ء تک قائم رہی۔ اودھ میں ثقافتی زندگی کا پہلا محور فیض آباد تھا پھر بعد میں لکھنؤ بنا۔ آصف الدولہ نے لکھنؤ کو دارالسلطنت بنایا۔ آصف الدولہ نے نہ صرف اس شہر میں فن کی قدر کی بلکہ اُس نے اس شہر کو سرسبز بنانے میں بھی بھرپور کردار ادا کیا۔ بہت سارے باغات لگوائے جس باعث دنیا بھر کے سیاح اس کی طرف راغب ہوئے، اس شہر کو "باغوں کا شہر" اور "سبز سمندر" کہا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ لکھنؤ نے ان باغوں کی محبت میں اپنے محلوں کا نام بھی ان باغوں کے ساتھ منسوب کیے۔ انھی باغوں میں ایک باغ "قیصر باغ" تھا، جن کا ذکر نیّر کے افسانے "طاؤس چمن کی مینا" میں بھی ہے۔ اس باغ کے نام سے نیّر مسعود نے ایک مضمون "قیصر باغ: غلامی کے پہلے سے آزادی کے بعد تک" لکھا جو رسالہ نیا دور شمارہ ۵، جلد ۵۳ (لکھنؤ، ۱۹۹۷ء) میں شائع ہوا۔ اُنھوں نے اس تاریخی باغ کے بارے میں جن جن کتابوں سے استفادہ کیا ان میں ایرانی سیاح میر عبداللطیف شوستری کا سفر نامہ تحفۃ العالم رسالہ الناظر لکھنؤ، ستمبر ۱۹۲۶ء اور مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۸۹۴ء۔ نیّر مسعود نے قیصر باغ کی تعریف میں امیر مینائی کی نثر اور غزل بھی بطور نمونہ پیش کی ہے۔

قیصر باغ بنیادی طور پر ایک ایسا باغ تھا جس کا ذکر کچھ مثنویوں سفر ناموں، تاریخی کتابوں یا غزلوں کے اندر موجود تھا، مگر اس کا مکمل تعارف نہیں تھا جس باعث نیّر مسعود نے اس تاریخی مقام کو اہمیت دیتے ہوئے واجد علی شاہ کے کچھ نقش ابھارنے کی کوشش کی۔ طاؤس چمن کی مینا کے پس منظر میں جو عکس چل رہا ہے وہ اسی قیصر باغ کا ہے۔ اس عمارت کے بارے میں نیّر مسعود کہتے ہیں:

> "یہ عمارت واجد علی شاہ نے ۱۸۵۰ء میں بنوائی اس عمارت میں نہایت خوبصورت مکان اور عمارتیں شامل ہیں۔ ایک ہزار سے زیادہ شاہی محلات کے قیام کے لیے مکانات بنے ہوئے تھے۔ قیصر باغ مجموعی حالت میں ایک بے نظیر عمارت ہے اور واجد علی شاہ کے سلاستِ ذوق اور ندرتِ خیال کا ثبوت یہ آخری بادشاہِ اودھ کا عشرت خانہ تھا یہاں ہمیشہ دن عید اور رات شبِ برأت رہا کرتی تھی۔"(۱)

اس تاریخی عمارت کے تمام خدوخال، بارہ دریاں، پھاٹکیں اور دیگر جزئیات کو نیّر مسعود نے مکمل مہارت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس طرح کے اسلوب سے عمارت میں کرداروں کی موجودگی عقل کے بہت قریب محسوس ہوتی ہے۔ اسی عمارت میں ایک حصہ ہے جسے "بادشاہ منزل" کہا جاتا تھا اور بادشاہ یہیں پر ریذیڈنٹ سے ملتے تھے اس حصہ میں جنرل اوٹرم نے انگریزی حکومت کو یہ فیصلہ بھی سنایا تھا کہ اودھ کا الحاق کر لیا گیا ہے۔ اسی سبب دیسی لوگ عمارت کے اس حصہ کو "غارت منزل" کہتے تھے۔ نیّر مسعود نے قیصر باغ کا نقشہ کمال مہارت کے ساتھ بیان کیا

ہے۔اس عمارت کے اندر دیگر عمارتوں کے نام سردار محل، یاسمن محل، فردوس منزل، معشوق محل اور نواب محل وغیرہ ہیں۔اس تاریخی عمارت کی لاگت پر اسّی لاکھ روپے صرف ہوئے اوراس کا رقبہ چار میل تھا۔انھوں نے اس عمارت کے ساتھ وابستہ تمام کرداروں جن میں بیگمات، نوکرانیاں، وزیر، ان کے معاملاتِ زندگی کو بہت رچاؤ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

نیّر مسعود کی لکھنؤ سے وابستگی کی اس سے عمدہ مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ اُنھوں نے اس شہر کے لوگوں کے علاوہ عمارتوں اور باغوں سے ہمدردی کا جذبہ قائم رکھا اوراُن پر علمی نوعیت کی مضامین لکھے۔ قیصر باغ کے ساتھ یہ سانحہ پیش آیا کہ اس پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا اوراس کے حُسن کو بری طرح پامال کیا وہ تمام چیزیں جن پر لکھنؤ کے ہنرمندوں کے کمالات ثبت تھے انھیں انگریزوں نے بے قدری کے ساتھ توڑ پھوڑ دیا۔باغ کے اندر بیگمات کی کوٹھیاں اودھ کے اُن راجاؤں کے قرابت داروں کو سونپ دیں جنھوں نے انگریزوں کے ساتھ وفاداریاں کیں۔ نیّر مسعود نے لکھنؤ میں تو کیا برصغیر میں بھی انگریزوں کی عمل داری پسند نہیں کی۔

نیّر مسعود کے افسانوں میں یا دیگر تخلیقات میں ہم اس لکھنؤ کی جھلک دیکھ سکتے ہیں جو آصف الدولہ نے آباد کیا تھا۔اگرچہ نیّر مسعود کا زمانہ بعد کا زمانہ ہے جب لکھنؤ کی تہذیب زوال پزیر تھی، مگر ہم اُن کی تخلیقات میں لکھنؤ کا معاشرہ، اقتصادی حالات، صنعت و حرفت، عسکری نظام، اودھ کی ثقافت پر ایرانی اثرات، نمود و نمائش کا فروغ، زرعی حالت، سیاسی طاقت کا زوال، مجلسی زندگی، سامانِ حرب کی اقسام، پرانے حساب کتاب اشیائے خورد کے بھاؤ، لکھنؤ میں مختلف قبیلوں کے رسم ورواج، دیگر مشاغل جن میں جانورں کی لڑائی، جانوروں کی اقسام، پرندوں کے نام اور پرندوں کی اقسام، پتنگ بازی، لکھنوی ملبوسات، لکھنؤ کی عمارتیں، ڈیوڑھیاں ،احاطے، محراب، امام باڑے، حویلیاں، طرزِ کلام، شادی بیاہ کی رسمیں، مختلف طرح کے معروف کردار جو اس زمانے میں اپنے مخصوص خصائص کی وجہ سے جانے مانے جاتے تھے۔پہلوانوں کے نام، جنگی مشقوں کے نام اور ماہر نشانہ بازوں کے نام، صابن بنانے والے، منجن بنانے والے، شیشہ سازوں کے نام، نقلیں اتارنے والے، بھانڈ، گویے، شاعر، نوحہ خواں، بڑے بڑے معروف حکیم، علمِ جعفر اور علمِ رمل کے ماہر، مختلف پتھر شناس جوہریوں کو دیکھا جاسکتا ہے۔

نیّر مسعود کے افسانوں میں یہ کوشش شعوری طور پر نظر آتی ہے کہ انھوں نے تخلیقی متن میں مقام، وقت اور کرداروں کی اسمی شناخت مخفی رکھی ہے، مگر کسی نہ کسی طور قارئین کے ذہن میں نیّر مسعود کے تخلیقی متن کے پس منظر کے بارے میں جو ہیولا سا تشکیل پاتا ہے اُس کے خدوخال لکھنوی تہذیب کے شہر، بستیوں ، آبادیوں، محلوں، سڑکوں سے بہت مماثل ہوتے ہیں۔

نیّر مسعود کے والد مسعود حسن رضوی ادیبؔ کو بھی اسی شہر کے سحر نے گرفتار کیا تھااور وہ آبائی وطن "نیوتنی" چھوڑ کر لکھنؤ کے ہو بیٹھے یہاں تک الہ آباد کے عارضی قیام نے بھی اُن سے لکھنؤ نہیں چھڑوایا۔ نیّر مسعود نے اسی شہر میں آنکھ کھولی اوراس شہر کے لیے دوہری محبتیں پائیں۔ تقسیم ہندوستان کے دنوں میں بھی وہ اسی شہر میں قیام پذیر رہے اور ہجرت پر آمادہ نہ ہوئے۔ وہ اس شہر سے کسی بھی مقصد کی خاطر جدا نہیں ہوئے الہ آباد میں پی۔ ایچ ڈی کے دوران چند دن وہ گھر سے دور رہے، مگر بہت جلد وہ واپس آجاتے تھے۔ نیّر مسعود نے اپنی زندگی میں کوئی لمبے چوڑے سفر نہیں کیے۔ ایران کی طرف جانا اُن کی زندگی کا وہ سفر ہے جو ہندوستان سے باہر ہے، یہاں بھی وہ اٹھارہ دن تک رہے۔ تمام عمر اُنھوں نے اسی شہر کی آغوشِ کشادہ سے لپٹ کر گزاردی۔ نیّر مسعود لکھنؤ شہر میں محلہ اشرف میں آبائی گھر "ادبستان" میں ہی زیادہ وقت گزارتے تھے۔

ادیبؔ کے تخلیقی متن میں شہر لکھنؤ کی معاشرت، تہذیب، سماج کو جس محبت اور اپنائیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اُسی سلسلے کو نیّر مسعود نے دوگنی محبت اوراپنائیت کے ساتھ آگے بڑھایا ہے۔ نیّر مسعود نے جو کردار تخلیق کیے ہیں وہ مکمل طور پر لکھنوی معاشرت اوراس کے عروج وزوال کی علامتیں ہیں۔ ان کرداروں کے حلیوں اورر ویوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کسی مضبوط تہذیب سے بچھڑے ہوئے کردار ہیں۔ اپنے اندر بہت ساری تخلیقی صلاحتیوں کے علمبردار اور ہر دم کسی خوابیدہ اذیت میں مبتلا یہ کردار اُن کے گردونواح میں پائے جاتے تھے، جن کے ساتھ نیّر مسعود کی روز ملاقات کسی نہ کسی یاد سے لپٹ کر ہوتی تھی۔ ان کرداروں کے نام، اعمال، پیشے، مشاغل، ہنر مندیاں، کمالات، فن، زبان ، تہذیب، رکھ رکھاؤ ہمیں لکھنؤ کی تہذیب کی یادیں دلانے میں مکمل طور پر کامیاب ہیں۔ ان کرداروں نے اپنے حافظے کو کھو کر بھی اسی شہر کی تہذیب کے اثرات منعکس کیے ہیں۔

نیّر مسعود کو اس شہر سے بے پناہ محبت تھی وہ خود اس تہذیب کے صادق اور کھرے نمائندے بن کر ادب میں ظاہر ہوئے۔ اُن کی تخلیقی زبان، لباس، مزاج، گفت گو، ادبی سرگرمیاں سب کچھ اسی شہر کی تہذیب کی غمازی کرتی ہیں۔ لکھنؤ سے اُن کی عقیدت کو پروان چڑھانے میں ادیبؔ کے فکری موضوعات کا بہت بڑا ہاتھ ہے اور پھر پی۔ ایچ ڈی کا مقالہ "رجب علی بیگ سرور: حیات اور کارنامے" بھی شامل ہے۔ اس موضوع پر جب نیّر مسعود نے کام کیا تو اُنھوں نے سرورؔ کی تخلیقات کو سمجھنے کے لیے اس کے زمانی عہد میں جھانکنا ضروری سمجھا، کیوں کہ تخلیق کار کے تخلیقی عوامل کو دیکھنا بہت ضروری ہوتا ہے اوراس میں عمرانی تناظر کسی صورت غیر معمولی نہیں ہوتا۔

سرورؔ کے ہاں خود بھی تو لکھنؤ سے بے پناہ عقیدت تھی وہ خود کان پور رہ کر لکھنؤ کو یاد کرتے تھے اور بار بار دیوانہ وار اس شہر کی جانب لوٹ آتے تھے۔ "فسانہ عجائب" میں لکھنوی معاشرت کو جس ہنر مندی سے بیان کیا گیا ہے

اُس کی مثال نہیں ملتی۔ نیّر مسعود نے سرورؔ کی لکھنؤ کے ساتھ محبت کے بارے میں جو دلائل دریافت کیے ہیں وہ بھی لکھنؤ کے بارے میں کثیر مطالعے اور جان کاری کی گواہی دیتے ہیں۔ اُنھوں نے لکھنؤی تہذیب کے بارے میں جن جن کتابوں سے راہنمائی حاصل کی اُن میں کافی کتابیں "ادبستان" کے ذخیرہ سے حاصل کی گئیں۔ اسی وجہ سے نیّر مسعود کی لکھنؤ سے محبت میں ہم ادیبؔ کو منظر نامے سے غائب نہیں کر سکتے۔

نیّر مسعود کے افسانے ثقافتی وجود کی تلاش کا بیانیہ بھی ہیں جس میں لکھنؤ کی تہذیب پیش پیش ہے۔ اُنھوں نے لکھنؤ کی تہذیب کو ایک عام آدمی کے نقطہ نظر سے پیش کیا ہے۔ عام آدمی جو اُس وقت لکھنؤ کی زوال آمادہ تہذیب میں مرکز میں ہونے کی بجائے حاشیہ پر نظر آتا ہے۔ ثقافتِ لکھنؤ اُن کے سینے میں ایک سلگتا ہوا راز ہے جس کو عیاں کرنے میں زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو کر اسمی شناخت سے بھی آزاد ہو جاتے ہیں۔ وہ ایک مشترکہ تہذیب کے گم ہو جانے کی چارہ گری خود کو گنوا کر کرتے ہیں۔ اُنھوں نے ایک محقق ہونے کے ناطے شہر کی اسمی شناخت بھی چھپانے کی کوشش کی ہے، مگر اپنی لفظیات میں جو نظام سامنے لاتے ہیں اُس سے قاری کے ذہن میں جو تصویر بنتی ہے اُس کا نام یقیناً لکھنؤ ہی ہے۔ اقدار، تہذیب، کردار، زبان، کھیل، مشاغل، رسومات کا جو ذکر کیا ہے اُس سے پُرانے لکھنؤ کی جھلک ہی سامنے آتی ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ ہم لکھنؤ میں ہی گھوم پھر رہے ہیں یا زیادہ دور جائیں تو اس کے گردونواح میں ہی وہ گھوم پھر لیتے ہیں قریبی شہروں کا بھی ذکر ملتا ہے، جن میں خالق آباد، فیض آباد، الہٰ آباد، کلکتہ یا عظیم آباد جیسے شہر ہیں۔ نیّر مسعود اپنی زندگی میں نہ تو دور دراز نکلے اور نہ ہی تخیل کو اتنی تکلیف دی کہ وہ دور دراز کی بستیوں شہروں اور ملکوں کے نقش پیش کرے، بلکہ جس بجھتی ہوئی روشنی کو انھوں نے کچھ کچھ دیکھا تھا اس کی ایک کامیاب تصویر اُنھوں نے اپنے افسانوں میں دکھانے کی کوشش کی ہے۔ معمولی سی نشانی سے بھی وہ ماضی کو اور ماضی سے جڑی رونقوں کو زندہ کر لینے کے ماہر ہیں۔ اُن کے افسانے تہذیبِ لکھنؤ کے امانت دار گواہ ہیں، اُن کے متن میں دوائیں بنانے والے عطار، حکیموں کے گھرانے، پتنگ باز، شیشہ گر، صابن بنانے والے، کیمیا دان، بے روزگار لوگ، مختلف تہوار، طوائفیں، تاریخی عمارتیں، مثلاً۔ زین العابدین کی کوٹھی، کٹورا گنج، آغا میر کی سرائے، نواب سہراب کی حویلی، کا ذکر بھی ملتا ہے۔

اپنے افسانے "بن بست" میں لکھنؤ کے چند دروازوں کا ذکر کرتے ہیں۔ اکبری دروازہ، رومی دروازہ، گول دروازہ، صدر دروازہ، مزید "بُن بست" میں ایسے مقامات کا ذکر کرتے ہیں جن مقامات کے وجود کی واضح پہچان شہر لکھنؤ میں ہے۔ مثلاً

> "دوپہر تک شیش محل، حسین آباد، مفتی گنج سے لے کر ٹھاکر گنج، چوک، سعادت گنج تک کا چکر لگا لیتا تھا۔"(۲)

طاؤسِ چمن کی مینا بھی لکھنوی تہذیب کا عکاسی ہے۔ پورے افسانے میں مختلف مقامات کا ذکر کیا گیا ہے۔ جن میں قیصر باغ، گومتی کا کنارہ، حسین آباد مبارک، امام باڑے، چڑیا بازار، بادشاہ منزل، اسد چمن، حسین آباد کے پھاٹ، لکھی دروازہ، نصیر الدین حیدر بادشاہ کا انگریزی ہسپتال، آصف الدولہ بہادر کا امام باڑہ، بندے علی، محمد علی شاہی مکان، وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ کچھ اقتباسات بھی دیکھیں۔

"دروغہ نبی بخش نے مجھ کو قیصر باغ کے طاؤس چمن میں ملازمت دلائی تھی۔ اس سے پہلے میں گومتی کے کنارے جانوروں کے رمنوں کے آس پاس آوارہ گردی کیا کرتا۔"(۳)

"گنجفہ" میں دیکھیں کس طرح لکھنؤ شہر کے مقامات کا ذکر کیا گیا ہے۔

"پھر کیا، اللہ کے بندے نے ہمت نہیں ہاری۔ پہلے تو رستم نگر اور شاہ گنج والے مکان بیچے۔"(۴)

"یہ کاغذ ہے منجانب علی محمد عرف لاڈلے ولد علی حسین عرف دلارے نواب ساکن شہر لکھنؤ محلہ چوک پیپل والا مکان۔"(۵)

اور پھر عزاداری، مجالس، مکان، ڈیوڑھیاں، احاطے، محراب، سرائیں، محل سرائے، یہ تمام ایسے نشانات ہیں جن میں وہ شہر لکھنؤ کی تصویر دکھانے میں کامیاب ہیں۔ معاشرے میں افراد کے اظہار کے ابلاغ کا وسیلہ ادب ہے ۔ اس حوالے سے اٹھارویں صدی کے ایک مفکر ڈی بونالڈDe-Bonad کا قول ہے" Literature is the Expression of society" تخلیقِ ادب میں معاشرہ کی مداخلت کو ہر صورت تسلیم کرنا پڑتا ہے کیوں کہ اس میں زبان کا عمل دخل بہت حد تک ہے اور زبان ثقافت کی تخلیق ہے۔ پھر ادب جس ہئیت کو اظہاری مقصد کے لیے منتخب کرتا ہے وہ بھی معاشرتی عوامل کے تعاون سے نمو پاتی ہے۔

نیّر مسعود کا تعلق ایک ایسے شہر سے ہے جس کا نام آتے ہیں ایک تہذیب و تمدن اور رکھ رکھاؤ کا چراغ چپکے سے ذہن میں جگمگا اُٹھتا ہے صوبہ اودھ میں دریائے گومتی کے کنارے آباد شہر کائنات کے جوہر سمیٹے ہوئے ہے ہر طرف آرٹ ہی آرٹ ہے۔ اس شہر میں بہت سارے نشانات ایسے ہیں جس سے اس شہر کے ماضی کی چمک دمک دیکھی جاسکتی ہے جس شہر میں باغات، محلات، کوچے، احاطے، بازار، مندر، امام باڑے، مسجدیں، مقبرے، مزارات، سرائیں ، یہ سب لکھنو کے ماضی کی یادیں ہیں کچھ افسانوں میں یہ ذکر بہت واضح انداز میں کیا گیا ہے اسی شناخت واضح کی گئی ہے اور کہیں شہر کے خدوخال بیانیہ کی مدد سے کہانی کے پس منظر میں ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور قاری کو ضرور محسوس ہوتا ہے کہ ہم شہر لکھنؤ کی تہذیب سے اٹھنے والے کرداروں اور کہانیوں کی فضا میں سانس لے رہے ہیں اور یہ رنگ بڑی شدت سے ہیں۔

لکھنوَی تہذیب کے اس افسانہ نگار کے ہاں سرشار، رجب علی بیگ سرور اور مرزا ہادی رسوا سے الگ انداز پایا جاتا ہے۔ نیّر مسعود کے ہاں کسی ایک نشان سے پورے منظر کی ٹوہ لگانے کی کوشش نظر آتی ہے ایسی صورتِ حال میں اُن کا محقق ہونا اُن کے لیے بہت بہتر ثابت ہوا کہ وہ ماضی کی بازیافت میں جذبات کی رو میں بہتے نظر نہیں آتے بلکہ ہر قدم پھونک پھونک کر رکھا گیا ہے، یہ مشاہدہ کی کڑی آزمائش ہے اس میں بیانیہ کی سنجیدہ صلاحتیں سامنے لانی پڑتی ہیں اور جب تک ایسے موقعوں پر عبارت کی رنگینی نہ دکھائی جائے بات جچتی نہیں، مگر انھوں نے نثر کی قوت سے کام لیتے ہوئے شہر کی منظر کشی کی ہے، وجود اور عدم کی تلاش سے نیّر مسعود کا شعور الجھتا ہوا نظر آتا ہے۔ انتظار حسین اور نیّر مسعود میں اجتماعی حافظے کی بازیافت کی قدر مشترک ہے اور اس میں کسی حد تک فرق بھی ہے اس بارے میں امجد طفیل نے اپنے مضمون "اجتماعی حافظے کی بازیافت" میں کہا ہے کہ:

> "نیر مسعود کے افسانوں کے تہذیبی منظر کی تشکیل ان عناصر سے ہوئی ہے جو لکھنوَ کی معاشرت سے عبارت ہے۔ بعض جگہ تو انھوں نے انسانی کرداروں کے ساتھ ساتھ افسانے میں 'مکان' کو بھی بے نام رکھا ہے، جس افسانے میں عمومیت کا تاثر زیادہ گہرا ہو جاتا ہے، لیکن جہاں جہاں ان کی تہذیب، معاشرہ اور شہر کسی نام کا حامل دکھائی دیتا ہے تو وہ لکھنوَ ہی ہے، یہاں ہمیں اس تہذیب کا عروج دکھائی دیتا ہے جو رفتہ رفتہ زوال سے دوچار ہو رہی ہے اور جس کے زوال آمادہ نقش نیر مسعود کے افسانوں میں جابہ جا بکھرے دکھائی دیتے ہیں۔ تہذیبی علائم پر یہ زور انھیں دوسرے جدید اور علامت پسند افسانہ نگاروں سے جدا کرتا ہے اور ایک خاص حد تک انتظار حسین کے قریب لے آتا ہے لیکن یاد رہے کہ انتظار حسین اور نیر مسعود کے مزاج اور چیزوں کو دیکھنے کے انداز میں بنیادی فرق ہے۔ یہ فرق دونوں کے تجربات کی بدولت پیدا ہوا ہے۔ انتظار حسین ایک جمی جمائی تہذیب اپنے پیچھے چھوڑ آئے تھے، جس کی یاد ہمیشہ ان کی تخلیقی رنگت نمایاں کرتی ہے اور ماضی کی طرف بار بار پلٹنے کا رویہ ان کے افسانوں میں وہ کیفیت پیدا کرتا ہے جسے بدنامی کے محور پر نوسٹیلجیا کہا جاتا ہے جب کہ نیر مسعود اپنی تہذیب میں جمے رہے۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے اس تہذیب کو اجڑتے اور مٹتے دیکھا۔"(۶)

لکھنوَ کی تہذیب میں گلیوں کی رونق، بازاروں میں لوگوں کی آمدورفت، شاعر، دانشور، عالم فاضل حضرات، صاحبانِ کمال، اہلِ ہنر، غرض ہر طرح کے ایسے لوگ جن کا تعلق آرٹ سے تھا لکھنوَ کی جانب دل گرفتہ چلے آتے تھے۔ محلات، شاہی عمارتیں، ڈیوڑھیاں، مدرسے، حویلیاں، احاطے تعمیر ہوتے چلے جا رہے تھے، مگر افسوس کہ

انگیزوں کی غارت گری سے اس شہر کا حسن ماند پڑنے لگا۔ رونقیں، محفلیں اجڑنے لگیں نیّر مسعود نے مٹتی ہوئی شناختوں کو اپنی فکر کا حصہ بنایا۔ اُن کے افسانوں میں ڈیوڑھیوں کا بہت ذکر ملتا ہے اور اگر ہم یہ دیکھنا چاہیں کے اس لفظ کا استعمال اُن کے ہاں اتنا زیادہ کیوں ہے تو لکھنوی تہذیب میں ڈیوڑھیاں ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ محل، محل سرا اورڈیوڑھی ان تینوں لفظوں کو بالعموم قریب قریب ایک معنی میں ہی لیا جاتا ہے کیوں کہ ان کا تعلق عمارت کے ساتھ ہے، مگر ان میں فرق بھی ہے۔ محل سے مراد بلند و بالا عالی شان عمارت جس میں کسی امیر کی رہائش ہو، لیکن محل بالعموم ایک منزلہ ہوتے تھے "محل سرا" سے مراد ایک پورے عمارتی سلسلے کا نام تھا اس میں زنانے اور مردانے حصے ہوتے تھے، لیکن ڈیوڑھیاں صرف شہزادگان، نوابین کے ورثا، اقربا یا خالص عمائدین کی اقامت گاہوں کے لیے مخصوص تھیں، یہاں پر لوگوں کی دادرسی اور پرورش ہوتی تھی اہلِ لکھنؤ کی یاداشتوں میں آج بھی چھوٹی شہزادی کی ڈیوڑھی، سلیمان قدر کی ڈیوڑھی، آغامیر کی ڈیوڑھی محفوظ ہیں، مگر اب یہ ڈیوڑھیاں صرف اور صرف تاریخ کا حصہ ہیں ان کے نام و نشان مٹ چکے ہیں۔ لکھنؤ کی یہ ڈیوڑھیاں علم و ادب کی امین، مشاعروں، مجالسوں کی علمبردار ہیں ان کا مٹ جانا اُن کے نزدیک لکھنوی تہذیب کا بہت بڑا نقصان ہے۔ شیخ ناسخ کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیں:

ڈیوڑھیاں پر بحر حفظ جاں عبث ہے بندوبست
موت پھر جاتی ہے کوئی چوب درباں دیکھ کر

کچھ اقتباسات جس سے ڈیوڑھیوں کی اہمیت واضح ہوتی ہے:

"لیکن اتنا اندازہ ہوتا تھا کہ صحن کے تین طرف دالان ہیں، اوپر کی منزل نہیں ہے اور ڈیوڑھی سے متصل باورچی خانہ، غسل خانہ، مرغی خانہ وغیرہ۔ دالانوں کے پیچھے کوٹھڑیاں تھیں اور سب باہر سے بند معلوم ہوتی تھیں"(۷)

"صدر دروازہ کھلا ہوا تھا۔ قریب سے دیکھنے پر پتا چلا کہ اس کے دونوں پٹ زمین پر جم چکے ہیں۔ ڈیوڑھی بڑی تھی۔ دیواروں سے چونا اور پلستر جھڑ رہا تھا، لیکن فرش صاف تھا۔"(۸)

اسی طرح چند سرائیں اور احاطے بھی اپنے زمانے میں لکھنؤ میں مشہور تھے۔ نیّر مسعود نے اپنے افسانوں میں ان کا ذکر بھی بارہا کیا ہے۔ لکھنؤ کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے چند سراؤں اور احاطوں کا ذکر بھی ملتا ہے جن میں مغل سرائے، ہرن والی سرا، میوے والی سرا، بانس والی سرا، سرائے تحسین علی خان، سرائے معالی خان، سرائے مکادرزی، دربجے سنگھ کی سرا، سرائے مینڈو خان، اور اسی طرح کچھ احاطے بھی بہت مشہور تھے اور اُن کی اسی شناخت

چھپا کر لفظ احاطے کا ذکر اُنھوں نے بہت کیا ہے۔ چند مشہور احاطوں کا نام سیدوں کا احاطہ، رام داس کا احاطہ، احاطہ کمال جمال، احاطہ سلیماں قدر، تلسی رام کا احاطہ، احاطہ رمضان علی خان، جن کا تفصیلی تعارف یہاں درکار نہیں۔

نیّر مسعود کو اس شہر سے بے پناہ محبت تھی اور وہ جہاں گئے لوٹ کر اس شہر کی آغوشِ کشادہ میں آئے ،زندگی میں کوئی اتنا بڑا سفر بھی نہیں کیا بلکہ اپنے آبائی گھر "ادبستان" میں ہی رہے۔ لکھنوی تہذیب کے ساتھ عقیدت کے بارے میں آصف فرخی کو دیئے گئے انٹرویو میں کہتے ہیں۔

> "But it is also true that the atmosphere of my stories is none other than the atmosphere of this city .A City which concerns me a great deal. Not only because it is my birth place. But also because it is .in reality a wondrous city.I have witnessed a lot here including decay .when I was born. The society was well along in its decline. It only got worse with time you mentioned arches(mihrab) let me tell you something. Arches affect me personally I find them very evocative. The mere sight of an arch touches off a whole train of thought in me."(9)

نیّر مسعود کے ہاں لکھنوی تہذیب کی موجودگی کے بارے میں بات کرنے والے ناقدین میں ۔ تمثال مسعود، خالد جاوید، ناصر عباس نیر، سکندر احمد خان، امجد طفیل، امتیاز احمد، پروفیسر قاضی افضال حسین، شافع قدوائی، ڈاکٹر نور فاطمہ، ڈاکٹر سہیل احمد خان شامل ہیں ۔ ناصر عباس نیر نے اپنے مضمون ۔ "نیّر مسعود کے افسانوں پر ایک نوٹ" میں لکھا ہے کہ:

> "خاص بات یہ ہے کہ وہ اپنی اودھ کی گم شدہ ثقافت کا بیانیہ اس عام آدمی کی زبانی کرتے ہیں جو اس وقت اشرافیہ ثقافت کے حاشیے پر تھا۔"(۱۰)

طاؤسِ چمن کی مینا کے حوالے سے اُنھوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے جس میں واحد متکلم راوی کو حاشیائی طبقے کا فرد ٹھہرایا ہے ،کالے خان کی بیٹی فلک آرا کو مینا فلک آرا کامل جانا عوامی اور حاشیائی کلچر کی مرکزی اشرافیہ کلچر سے اپنی شناخت تسلیم کرانے کی موثر علامت ہے۔

مراسلہ، جرگہ، جانوس، دستِ شفا، طاؤسِ چمن کی مینا، گنجفہ، وقفہ، بُن بست، اور خانہ وزیر ایسے نمائندہ افسانے ہیں، جن میں واضح طور پر لکھنؤ کی تہذیب کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ چند اقتباسات اُن کے تخلیقی متن سے ملاحظہ ہوں:

"کچھ دیر بعد میر امحلہ پیچھے رہ گیا۔ غلے کی منڈی آئی اور نکل گئی۔ پھر دواءوں اور مسالوں کی منڈی آئی اور پیچھے رہ گئی۔ ان منڈیوں کے داہنے بائیں دور دور تک پختہ سڑکیں تھیں جن پر کھانے پینے کی عارضی دکانیں بھی لگی ہوئی تھیں، لیکن میں جس سڑک پر سیدھا آگے بڑھ رہا تھا، اس پر اب جا بجا گڈھے نظر آرہے تھے۔"(۱۱)

"آخر اشرف آباد کے ایک رئیس میر زاجانی کی نواسی پر نظر ٹھہری۔ لڑکی کے باپ محمد تقی صاحب نان پارے میں رہتے تھے لیکن باقی خاندان لکھنؤ میں مقیم تھا۔"(۱۲)

لکھنؤ شہر کی تہذیبی علامت ایک سطح پر اس شہر کے مکانات بھی ہیں، جن کی مدد سے بھی ہمارے ذہن میں لکھنؤ شہر کا خاکہ سامنے آتا ہے۔ ایک اقتباس دیکھیں۔

"نیا بنا ہوا مکان تھا، لیکن بہت چھوٹا تھا۔ چھوٹی سی ڈیوڑھی، چھوٹا سا دالان، چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں اور تنگ سا صحن جس میں امرود اور انجیر کے درخت بھی تھے۔ اکیلی ذات کے لیے بہت کافی تھا۔"(۱۳)

نیّر مسعود کے افسانوں میں نہ صرف لکھنؤ کی تہذیب کا ذکر ہے بلکہ ایک طرح اس تہذیب سے انسیت کی کیفیت محسوس ہوتی ہے، مثلاً:

"سات برس باہر رہا، لیکن حضور ڈاکٹر صاحب، لکھنؤ والے کا اور کہیں دل بھی تو نہیں لگتا۔"(۱۴)

"سب سے پتے کی بات حکیم علی افضل خاں صاحب نے کہی تھی کہ لکھنؤ میں رہ کے آدمی بننا چاہے تو بہت کچھ بن سکتا ہے اور بگڑنا چاہے تو جی کھول کر بگڑ سکتا ہے۔ مجھ کو صرف ایک بات سے مطلب تھا کہ یہاں علما اور اطبا بہت ہیں اور وہ دوسروں کو علم سکھانے میں دریغ نہیں کرتے۔"(۱۵)

کچھ افسانوں میں تو اپنے ہی اس اصول کی نفی کرتے ہیں کہ مقامات، شہروں اور بستیوں کی اسمی شناختوں کو ظاہر نہیں کرتے، مگر لکھنؤ شہر سے ایسی محبت ہے کہ اس کا ذکر براہ راست کیا جاتا ہے۔

"اُن کی ماں کی وفات لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ انھیں کینسر ہو گیا تھا۔"(۱۶)

"اس نے کہا لکھنؤ پہنچتے ہی ڈاکٹر صاحب کے روپے دے دینا۔"(۱۷)

لکھنؤ کی تہذیب کا جب اظہار کرتے ہیں تو اس کے تمام دیگر پہلوؤں کے ساتھ اس شہر کی عیش کوشی اور آرام پسندی کو بھی وہ نہیں بھولے۔

"اس لیے انھوں نے مجھ کو آگے پڑھنے کے لیے اپنی ایک منہ بولی بہن کے یہاں الہٰ آباد بھیج دیا۔ مجھ کو یقین ہے کہ وہ اُن بہن کو ہر مہینے میرے خرچ کے علاوہ اوپر سے بھی کچھ بھیجتی تھیں ۔ میرے الہٰ آباد جانے کے دوسرے تیسرے سال ابا کی وفات ہو گئی تھی، لیکن میری تعلیم الہٰ آباد ہی میں پوری ہوئی جس کے بعد میں لکھنؤ واپس آ گیا تھا، اور اب کئی سال سے آوارہ گردی کر رہا تھا اور اپنے مرحوم باپ کی طرح اماں کی کمائی کھا رہا تھا۔"(۱۸)

نیّر مسعود نے لکھنؤ شہر کی تہذیب کے بیان میں تمام ممکنہ امکانات کا ذکر کیا ہے جس سے اس شہر کا خاکہ بہت خوبصورت معلوم ہوتا ہے ۔ تعمیرات کے حوالے سے مختلف چیزوں کا ذکر بھی ملتا ہے، مثلاً محراب کا ذکر اس اقتباس میں دیکھیں:

"اب اس پھاٹک کی جگہ لوہے کا کٹہرے دار پھاٹک تھا جس کے پیچھے اصل عمارت میں داخلے والی اونچی محراب نظر آ رہی تھی۔ محراب کے پیچھے لوگ چل پھر رہے تھے، حالاں کہ وہ چھٹی کا دن تھا، یہ سوچ کر کہ شاید ان لوگوں میں کوئی میری جان پہچان والا مل جائے، میں پھاٹک سے گذر کر محراب کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچ کر میں نے دیکھا کہ محراب کی پیشانی پر بالکل ویسی ہی دو مچھلیاں اُبھری ہوئی ہیں جیسی میرے مکان میں استاد والے کمرے کے دروازے پر تھیں۔ مجھ کو حیرت ہوئی کہ اس درس گاہ میں اتنے دن تک آنے جانے کے باوجود ان مچھلیوں پر کبھی میری نظر نہیں پڑی۔ اب میں نے اُنھیں غور سے دیکھا۔ محراب کی شکستہ پیشانی کی مرمت کی جا چکی تھی۔ مچھلیاں بھی جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھیں۔"(۱۹)

اسی طرح احاطے کا ذکر بھی دیکھیں:

"وہ زیادہ تر خالی ہی پڑا رہتا تھا۔ اس احاطے میں ہمارے مکان کے علاوہ وہی ایک مکان تھا ۔ اس کا صدر دروازہ باہر سڑک پر کھلتا تھا، لیکن اس کے بڑے سے عقبی صحن کا چھوٹا دروازہ احاطے میں ہمارے صدر دروازے کے عین سامنے تھا۔"(۲۰)

پھر لکھنؤ کی زبان میں جو رکھ رکھاؤ اور تکلف ہے وہ بھی نیّر مسعود کے اسلوب میں شامل ہے، دیکھیں:

"حضور! کتے کو روک لیں تو میں چلا جاؤں۔"

"ابھی آندھی تیز ہے، کچھ دیر بیٹھ جاؤ،" میں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

"حضور کو زحمت ہو رہی ہو گی۔"(۲۱)

لکھنؤ شناسی کے حوالے سے نیّر مسعود کا دائرہ صرف ادبی جہات کو بیان کرنے تک محدود نہیں بلکہ انھوں نے لکھنؤ کی سماجیات کو بیان کرنے میں بہت عمدہ حوالوں سے کام لیا ہے۔ لکھنؤ کی تہذیب میں مرثیہ خوانی، عزاداری ومجالس، امام باڑے اور مقبرے بہت اہم حوالے ہیں۔ عہدِ شاہی میں ہر قسم کے فن کو بادشان کی سرپرستی حاصل تھی، بادشانِ اودھ مسلک کے حوالے سے شعیہ تھے جس باعث مجالس وعزاداری کا اہتمام بہت شاندار طریقے سے ہوتا تھا، محرم کے عشرے چالیس چالیس روز تک جاری رہتے تھے۔ نیّر مسعود خود بھی لکھنؤ کے رہنے والے ہیں اور مسلک کے حوالے شعیہ بھی تھے لہذا انھوں نے "لکھنؤ کے امام باڑے"، "لکھنؤ کے مقبرے"، "ماضی کا لکھنؤ اور محرم کے شب وروز"، اور " لکھنؤ کی یادگار مجلسیں "جیسے مضامین لکھ کر لکھنؤ کی عزادری کو بہت واضح کیا ہے۔ "لکھنؤ کی یادگار مجلسیں "رسالہ" نیادور"، شمارہ۱۱، ۱۲، جلد۴۸ (لکھنؤ، فروری، مارچ ۱۹۹۴ء) میں شائع کیا۔ یہ ایک ایسا مضمون ہے جس میں اُنھوں نے لکھنؤ کی بڑی بڑی مجالس میں جن میں عشرۂ محرم کی مجالس میں حُسینیہ غفران مآب، مدرسہ ناظمیہ، قصرِ حسینی، حسینیہ سید نقی صاحب کی مجالس شامل ہیں۔ اُنھوں نے پرانے لکھنؤ کی ان مجالس کے بارے میں کسی ماخذ سے استفادہ نہیں کیا بلکہ اپنی یاداشت اورآنکھوں دیکھے واقعات بیان کیے ہیں۔ تقسیم سے کچھ عرصہ قبل رئیسوں اور نوابوں کے مالی حالات کمزور ہونے کے باوجود وہ مجالس میں دل کھول کر پیسہ خرچ کرتے تھے۔ بہت خاص اہتمام کیا جاتا تھا حاضرینِ مجلس کی خدمت میں کوئی کسر نہ چھوڑی جاتی تھی۔ امام باڑوں کی آرائش وزیبائش آج بھی اس بات کی گواہ ہے۔ علمائے دین اور ذاکرینِ کرام کی خدمت اپنے ہی رنگ سے کی جاتی تھی۔ اس بارے میں نیّر مسعود کا بیان دیکھیں:

> "شاہی اوقات اور بڑے رئیسوں کے یہاں کی مجلسوں کا تبرک اصل مجلس سے بہت پہلے دعوتی رقعوں کے ساتھ تقسیم ہونا شروع ہو جاتا تھا اس میں زیادہ تر خاصگی کھانوں کے پورے پورے خوان ہوتے تھے اور یہ شہر کے خاص خاص لوگوں کے گھر بھیجا جاتا تھا۔ اصل مجلس میں الگ سے تبرک کی عام تقسیم ہوتی تھی۔"(۲۲)

نیّر مسعود نے لکھنؤ کے بارے میں کوئی باقائدہ کتاب تو شائع نہیں کی مگر اُن کے مضامین کی تعداد اس حد تک ہے کہ اُن کو یکجا کیا جائے تو لکھنؤ شناسی کے سلسلے میں ایک اہم کتاب سامنے آسکتی ہے۔ ان مضامین کی تعداد

اور موضوعاتی تنوع سے ہم نیّر مسعود کا شمار لکھنوی تہذیب کے امین لوگوں میں کر سکتے ہیں۔انھوں نے اس شہر کی ثقافت، سماج، معاشرت اور ہر اس نقش کو محفوظ کیا ہے جو مٹنے کے لیے تیار تھا،روبہ زوال تھا۔اُنھیں اس شہر کے تہذیبی خصائص ازبر تھے۔اس شہر کے باکمال لوگوں کے ساتھ نیّر مسعود کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔لکھنؤ کے بارے میں نیّر مسعود جو مضامین لکھے اُن میں، لکھنؤ کا عروج وزوال، قیصر باغ، قیصر باغ غلامی کے پہلے سے آزادی کے بعد تک، لکھنؤ کے امام باڑے، لکھنؤ کے مقبرے، پرانا لکھنؤ، عہدِ شاہی کے لکھنؤ میں کاست رئیسوں کی شادیاں، پرانے لکھنؤ کی جھلکیاں، ماضی کا لکھنؤ اور محرم کے شب وروز، لکھنؤ کی یادگار مجلسیں، اودھ میں فنِ سپاہ گری، اودھ کے حکمرانوں کی ادبی خدمات، پرانا دفتری نظام، لکھنؤ کی تپنگیں، ۱۸۵۷ء کے بعد لکھنؤ میں انہدامی کارروائیاں، لکھنؤ کی پوری تہذیب میں فن اور فن کار کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔صرف لکھنؤ کی تہذیب پورے صوبہ اودھ کی تہذیب جانی جاتی تھی، یہاں کے بادشاہان نے علم وادب کی سرپرستی میں جس لگن اور سنجیدگی کا مظاہرہ کیا اس کی نظیر نہیں ملتی، اسی باعث یہاں جو ادب تخلیق ہوا وہ امتیازی خصائص کے باعث عالمی ادب میں شمار ہوا بڑے بڑے نابغہ روزگار ادیب اسی شہر سے وابستہ ہیں۔نیّر مسعود نے افسانہ، تحقیق، تنقید، خاکہ نگاری، ترجمہ نگاری، تبصرے، خطوط ہر صنف میں لکھنؤی روایت کی پاسداری بہت ذمہ داری اور متانت سے اختیار کی۔

نیّر مسعود کے ہاں کئی کتابوں میں لکھنوی تہذیب کے اثرات بالواسطہ طور پر موجود ہیں مثلاً "رجب علی بیگ سرور حیات اور کارنامے، معرکہ انیس ودبیر، ادبستان، مرثیہ خوانی کا فن، یگانہ احوال وآثار، بزم انیس، انیس سوانح وغیرہ۔نیّر مسعود نے لکھنؤ کے حوالے سے "رجب علی بیگ سرور حیات اور کارنامے" میں باب اول "تعارف سیاسی اور تہذیبی پس منظر سرور کا ماحول" لکھا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ نیّر مسعود، "قیصر باغ: غلامی کے پہلے سے آزادی کے بعد تک"، (مضمون)، مشمولہ، ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ، اگست ۱۹۹۷ء، شمارہ ۵، جلد ۵۳، ص ۵۰۔

۲۔ نیّر مسعود، "طاؤس چمن کی مینا"، آج کی کتابیں، کراچی، دوسری اشاعت ۲۰۱۸ء، ص ۱۳۳۔

۳۔ ایضاً، ص ۱۲۴۔

۴۔ نیّر مسعود، "گنجفہ"، آج کی کتابیں، کراچی، پہلی اشاعت ۲۰۱۸ء، ص ۱۴۔

۵۔ ایضاً، ص ۲۷۔

۶۔ امجد طفیل، "اجتماعی حافظے کی بازیافت،"(مضمون)، مشمولہ، استعارہ، لاہور، جنوری تا مارچ ۲۰۱۸ء، شمارہ ۲، ص ۲۴۵۔

۷۔ نیّر مسعود، "طاؤس چمن کی مینا"، آج کی کتابیں، کراچی، دوسری اشاعت ۲۰۱۸ء، ص ۱۳۵۔

۸۔ نیّر مسعود، "گنجفہ"، آج کی کتابیں، کراچی، پہلی اشاعت ۲۰۱۸ء، ص ۱۱۲۔

9- htpp://digitallibrary,wise.edu/1793/12013/9jan2019"A conversation with NaiyerMasud"Author Farrukhi, Asif, translator, Memon, Muhmmad, Umar page no270, 271.

۱۰۔ ناصر عباس نیر، "متن، سیاق اور تناظر"، اسلام آباد، پورب اکادمی، س ن، ص ۲۵۹۔

۱۱۔ نیّر مسعود، "عطرِ کافور"، آج کی کتابیں، کراچی، دوسری اشاعت ۱۹۹۹ء، ص ۱۵۔

۱۲۔ نیّر مسعود، "گنجفہ"، آج کی کتابیں، کراچی، پہلی اشاعت ۲۰۱۸ء، ص ۱۵۸۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۵۱۔

۱۴۔ نیّر مسعود، "عطرِ کافور"، آج کی کتابیں، کراچی، دوسری اشاعت ۱۹۹۹ء، ص ۳۵۔

۱۵۔ نیّر مسعود، "گنجفہ"، آج کی کتابیں، کراچی، پہلی اشاعت ۲۰۱۸ء، ص ۱۵۰۔

۱۶۔ نیّر مسعود، "طاؤس چمن کی مینا"، آج کی کتابیں، کراچی، دوسری اشاعت ۲۰۱۸ء، ص ۹۷۔

۱۷۔ نیّر مسعود، "عطرِ کافور"، آج کی کتابیں، کراچی، دوسری اشاعت ۱۹۹۹ء، ص ۳۴۔

۱۸۔ نیّر مسعود، "گنجفہ"، آج کی کتابیں، کراچی، پہلی اشاعت ۲۰۱۸ء، ص ۱۰۔

۱۹۔ نیّر مسعود، "عطرِ کافور"، آج کی کتابیں، کراچی، دوسری اشاعت ۱۹۹۹ء، ص ۹۷۔

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۱۹۔

۲۱۔ ایضاً، ص ۳۴۔

۲۲۔ نیّر مسعود، "لکھنؤ کی یادگار مجلسیں"، (مضمون)، مشمولہ، ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ، فروری، مارچ ۱۹۹۴ء، شمارہ ۱۱، ۱۲ جلد ۴۸، ص ۵۳۔

References in Roman Script

1. Naiyer Masud,''Qaisar bagh ghulami ky pehly sy aazadi ky baad tak", (muzmon),mashmoola,mahnama,Naya daur, Luknow, agust1997, shumara5, jild53,P53.
2. Naiyer Masud,"Ta'oos chaman ki maina",aaj ki kitabeen,karachi,doosri ishaat2018,P133.
3. Aizan, P124.
4. Naiyer Masud,"ganjfa",aaj ki kitaben,karachi,pehli ishaat 2018,p14.
5. Aizan, p27.
6. Amjad tufail,"Ijtmahi hafzey ki bazeyaft", (muzmon), mushmoola, istaara,Lahore,January ta march2018, shumara2, p245.
7. Naiyer Masud,"Ta'oos chaman ki maina",aaj ki kitabeen, karachi, dosri ishaat2018,p135.
8. Naiyer Masud,"Ganjfa",aaj ki kitaben,karachi,pehli ishaat2018,p112.
9. Htpp://digital library,wise,edu/1793/12013/9jan2019"a conversation with naiyer masud" Author Farrukhi, Asif, translator, Memon, Muhmmad,Umar,p270.271.
10. Nasir abbas nayyar," Matn seyaq aur tanaazir",islam abad,porb akadmi.s n.p259.
11. Naiyer Masud,"Itr e kafur",aaj ki kitaben,Karachi,dosri ishaat1999,p15.
12. Naiyer Masud,"Ganjfa",aaj ki kitaben,karachi,pehli ishaat2018,p158.
13. Aizan,p151.
14. Naiyer Masud,"Itr e kafur",aaj ki kitaben,Karachi,dosri ishaat 1999, p35.
15. Naiyer Masud,"Ganjfa",aaj ki kitaben,karachi,pehli ishaat 2018, p150.
16. Naiyer Masud,"Ta'oos chaman ki maina",aaj ki kitabeen, karachi, dosri ishaat2018,p79.

17. Naiyer Masud,”Itr e kafur”,aaj ki kitaben,Karachi,dosri ishaat1999,p34.
18. Naiyer Masud,”Ganjfa”,aaj ki kitaben,karachi,pehli ishaat 2018, p10.
19. Naiyer Masud,”Itr e kafur”,aaj ki kitaben,Karachi,dosri ishaat 1999, p97.
20. Aizan, p119.
21. Aizan, p34.
22. Naiyer Masud,”lucknow ki yadgar majlisen”, (muzmon), mushmoola, mahnama naya daur,lucknow,February ta march1994,shumara11,12,jild48,p53.